قرۃ العین حیدر کا سفرِ ایران

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو،
یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

Abstract:

The article looks at the travelogue writing of the eminent Urdu novelist Quratulain Haider with a focus on "Koh-e Damavand" written about her travel to Iran. The article especially sheds light on her writing style, knowledge of history and understanding of human civilization. An appraisal has also been made of the writer's taste for Persian poetry, her perception for culture and her power of observation.

سفر نامہ اور رپورتاژ اگرچہ دو مختلف اصنافِ نثر ہیں تاہم بعض مشترکہ محاسن کی بنا پر کبھی کبھی یہ ہم معنی اور ہم صورت ہو جاتی ہیں۔ ان اشتراکات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

۱۔ حقیقت اور واقعیت نگاری
۲۔ غیر رسمی آغاز و انجام
۳۔ کسی واضح و منضبط پلاٹ کی عدم موجودگی
۴۔ واقعات کا دستاویزی و افسانوی بیان اور رپورٹنگ
۵۔ مصنف کا اپنی تحریر میں مرکزی کردار ہونا
۶۔ خاکہ نگاری، جذبات نگاری اور مکالمہ نگاری کے مواقع اور ان کے استعمال
۷۔ وحدتِ تاثر کی عدم موجودگی
۸۔ زندگی کے صرف مخصوص دورانیے کی روداد، تاریخ وار واقعات کا ذکر
۹۔ حقیقت کی ڈور سے وابستہ رہتے ہوئے تخیل کی آمیزش کی گنجائش (۱)

قرۃ العین حیدر کی تصنیف ''کوہِ دماوند'' بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں لذتِ سفر بھی ہے اور رپورتاژ کا رنگِ تازہ بھی!! یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے جو دراصل ایران کی دو مختلف سفری رودادیں ہیں۔ ایک مختصر اور دوسری قدرے مفصل! 'حصہ اول' کا آغاز خاصا ڈرامائی ہے۔ ابتدا میں رات کا منظر دکھایا گیا ہے۔ رنگین

تشبیہوں اور رومانوی تخیل نے منظر کشی کو 'شاعری' کے مترادف بنا دیا ہے۔ ابھی یہ 'شاعری' جاری ہوتی ہے کہ ایک 'افسانوی' کردار منظر میں داخل ہوتا ہے جس سے مصنفہ کا ایک طویل مکالمہ ہوتا ہے جسے طنز، تاریخ اور تہذیب کا مرقع کہنا چاہیے۔ مکالمے سے قبل وہ منظر ملاحظہ ہو جس سے بابِ سفر وا ہوتا ہے:

''جھلملاتے سپید دریچوں کے باہر خنک نیلگوں دھند لکے میں شمران کی ان گنت روشنیاں چراغِ لالہ کی طرح جھلملا رہی ہیں۔ ان کے عقب میں اودی چوٹیوں پر خسروِ عجم کے عظیم الشان برقی تاج جگمگاتے ہیں۔ بادل کوہ دماوند پر سے مؤدب خادموں یا متحیر سیاحوں کی مانند آہستہ آہستہ گزر رہے ہیں۔ چند لمحوں بعد یہ کاروانِ سحاب پہاڑیوں کے ادھر توران پہنچ کر ایک اور جشن پر شکوہ کا تماشا کرے گا۔ بسیط، منور، بیکراں رات میں یہ کاسنی بادل اندھیرے کیسپین سے اٹھے ہیں۔

''البرز کی گونجتی ہوئی چٹانوں پر سیمرغ پردوں میں چونچ چھپائے بیٹھا اونگھ رہا ہے اور باخبر ہے کہ چند فرسنگ پر کوہ طالقان اور کیسپین کے درمیان پراسرار جنگلوں، چراگاہوں میں براجنے والا لال دیو بغلیں بجاتا ہے کہ ہفت خواں طے ہوئی اور سفید دیو بالآخر مات کھا گیا۔ سفید دیو اور ارژنگ دیو اور شیراسپ، گستاسپ، جاماسپ، مہراسپ، ارجاسپ، اسفندیار، ''رستم رہا زمیں پہ نہ بہرام رہ گیا۔'' (۲)

افسانوی کردار جس سے مصنفہ کا شگفتہ مکالمہ رہتا ہے، دل چسپ شخصیت کا حامل سرکاری میزبان ہے جسے مصنفہ نے ایک پرندے کے مماثل قرار دیا ہے۔ پرندے کا نام ''عنقا'' ہے لیکن اس سے بات چیت کرتے ہوئے مصنفہ کا مدعا عنقا نہیں ہوتا بل کہ ایک ایسا مکالمہ تشکیل پذیر ہوتا ہے جو تاریخ و تہذیب کے حوالے سے معنی خیز تبصروں پر مشتمل ہے اور جس میں شوخی اور شاعری کی آمیزش ہے:

''بالکنی کے سفید پردے سرسرائے۔ ایک مختصر سی شے نے اندر جھانکا ''ہلو۔''

''ہلو۔'' میں نے تکیے سے سر اٹھایا اور گھبرا کر جواب دیا۔ ایک عجیب و غریب پرند پھدک کر سامنے آ گیا۔

''مجھے آقائے سیمرغ نے بھیجا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' پرند نے پھٹپھٹا کر کہا۔

''آقائے.....کون؟'' میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''خانم۔ آپ ابھی انہیں یاد فرما رہی تھیں۔'' پرند نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

''اوہ۔''

''موصوف خود نہ آ سکے کہ پردہ تو کول مانع ہے کیونکہ آپ نے بال کو۔''

''آگ نہ دکھائی۔'' میں کھل کھلا کر ہنس پڑی۔۔۔

۔۔۔اس کے بعد ''السلام علیکم'' پر اکتفا کی۔

''وعلیکم السلام۔'' پرند نے تقریباً علی گڑھ کے لہجے میں ڈپٹ کر جواب دیا۔

''معاف کیجئے گا۔'' میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں ذرا متعجب نظر آ رہی ہوں گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسا پرند میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''خانم! آپ بجا فرماتی ہیں۔ خاکسار عنقا ہے۔''

آقائے عنقا اب تازہ فارسی رسالوں کے انبار پر فروکش تھے۔ اچانک اپنے پنجوں کے نیچے ایک رنگین تصویر پر ان کی نظر پڑی اور وہ فوراً پھدک کر کاشانی قالین پر آئے اور اٹنشن کھڑے ہو گئے کہ وہ شاہ کی تازہ ترین تصویر تھی۔

اس محیر العقول صورتِ حال کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی۔

''آپ کو معلوم ہے آقائے عنقا کہ عین اس لمحے ماوراء النہر کے ادھر کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' عنقا نے پینترا بدل کے اب تلوویزیوں کا رخ کیا جس پر ایک اور عجمی زمزمہ سنج تھا۔

''اس پار۔'' میں نے دریچے میں جا کر سلسلۂ کوہ کی طرف اشارہ کیا۔ عین اس وقت سلطانیٔ جمہور کا جشن تاسیس منایا جا رہا ہے۔''

''آپ کے آئینۂ اسکندر کا حجم بہت مختصر ہے۔'' عنقا نے چالاکی سے میری سُنی ان سُنی کر کے کہا۔ ''ارباب ہتل کو تلقین کیجئے کہ آپ کے حجرے میں دوسرا آئینہ لگا دیں۔''

میں اس مسخرے پرند کو کہاں بخشنے والی تھی، اپنی بات پر اڑی رہی۔ ''نغمہ بیداریٔ جمہور، کابلستان، زابلستان، مارزندران، آذربائی جان، سب جگہ دیکھ لیجئے گا بہت جلد۔ جس طرح داغستان، کرغستان، قزاقستان۔''

''اور ہندوستان و پاکستان؟'' عنقا نے چالاکی سے پوچھا۔

''گلستان بوستان۔'' میں نے فوراً بات ٹالی۔

''سبحان اللہ! ماشاءاللہ!'' عنقا نے جواب دیا۔

''ساری اولاد آدم۔'' میں نے خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''آقائے آدم نے تو جوٹ ملیں قائم کر لی ہیں اور ادبی انعام دیتے ہیں۔'' عنقا نے بات کاٹی۔

''کس قدر بے تکا پرند ہے۔''

''آپ کبھی اڑ کر اس طرف تشریف لے گئے ہیں؟''

''کدھر؟'' اس نے تجاہلِ عارفانہ سے دریافت کیا۔

شمال میں آپ کا ایک پڑوسی ملک ہے۔ عجائب زرنگار ایسا خطہ کہ مرقعِ خیال مانی و بہزاد نے نہ کھینچا ہوگا اور پیر دہقان فلک نے مرزع عالم میں نہ دیکھا یعنی لال دیو کا دیس۔''

''تم نے فغفورِ چین کا تازہ بیان پڑھا؟'' عنقا نے جواباً استفسار کیا۔
''آقا پہلے میرے سوال کا جواب عطا ہو۔''
''یاجوج ماجوج کا۔'' عنقا نے ٹیلی ویژن کا بٹن گھماتے ہوئے جواب دیا ''سدِ باب ہو چکا ہے۔''
''بذریعہ انقلاب سپید؟''
''بالے۔''
''مگر آپ کو یاد ہے اے طائر لاہوتی کہ اس ملک میں جہاں آج عوج بن عنق نے بقیہ سفید دیوؤں کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے وہاں دو صد سال قبل ایک انقلاب آیا تھا اور۔''
''عوج بن عنق؟'' پرند نے پنجہ اٹھا کر ذرا سر کھجایا۔ ''مے دی! موسیو دی گال۔'' پھر وہ پھدک پھدک کر خوب ہنسا۔

''بالے۔'' میں نے کہا: ''ابھی وہی انقلاب بہت سے ملکوں میں آنا باقی ہے۔
اکتوبر والا تو دور رہا۔'' (۳)

حکایت لذیذ تھی اور مکالمہ دل پذیر ___ اس لیے ''قلم درازی'' کی گئی ہے۔

اس سفرنامے کی نثر خاصی شیریں اور شاعرانہ ہے۔ قرۃ العین نے اپنے فارسی شعری ذوق کے اظہار کے لیے نثر کو اشعار سے مزین نہیں کیا، ان کے 'شعری مقاصد' مختلف نوعیت کے ہیں۔ وہ دراصل تحریر میں ایک ایسی فضا اور ماحول تخلیق کرنے کی آرزومند ہیں جو ایرانی ہو اور جس سے 'مانوس اجنبیت' بھی جھلکتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کوشش میں کامیاب رہی ہیں۔

ان کے اسلوبِ نثر کے بارے میں راحیلہ یوسف رقم طراز ہیں:

''.....ان کے سفرناموں میں بھی راست اور اشاراتی دونوں طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے۔ کہیں ایک انداز غالب ہے، کہیں دوسرا۔ قرۃ العین حیدر نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ خالص بیانیہ انداز پر بھی اسی قدر قدرت رکھتی ہیں جس قدر شاعرانہ زبان پر۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حسبِ ضرورت دونوں طرح کی زبان استعمال کی ہے۔ ان کا اسلوب، زبان کے وسیع تر استعمال کی نشان دہی کرتا ہے۔ مکالمہ اور بیان سے واقعہ کو اس طرح ملاتی ہیں کہ قاری پر واقعہ اپنا بھرپور تاثر چھوڑتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مکالمے ان کے زبان و بیان کا ایک خوبصورت حصہ ہیں۔'' (۴)

سفرنامے میں ایران کی قدیم و جدید تاریخ کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اور ایران کے تہذیبی و ثقافتی مظاہر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ انقلاب سے قبل، شاہ کے زمانے کی شاہ خرچی، خوش حالی اور جشنِ تاج گزاری کی

جانب انگشت نمائی بھی کی گئی ہے۔ مصنفہ نے مہذب پیرائے میں سرور اور رقص و سرود کی محفلوں کا ذکر کر کے ایک خاص دور کی ثقافت اور معاشرت کو نمایاں کیا ہے۔ اس ضمن میں مصنفہ کے ہم وطن ایک حسرت زدہ بزرگ صحافی کی عشرتِ شبانہ کا تذکرہ ملاحظہ ہو:

جب فضائی لڑکی نے شراب پیش کی آپ نے پینا شروع کر دیا۔ وہ مجھ سے بہت آگے بیٹھے تھے۔ میں نے ایک آدھ بار اشارے سے منع کیا مگر اب وہ ''فارن ٹریول'' میں مصروف تھے، کس کی سنتے۔ طہران پہنچنے سے ذرا قبل ایرانی لڑکی نے شراب کا بل پیش کیا تو گھبرائے ہوئے میرے پاس آئے۔ ''دیدی گجب ہو گیا۔ یہ چھوکری ہمارا دیوالیہ نکال دیا۔ ہمارا سارا فارن ایکس چینج ختم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال تھا شراب بھی مفت ہے۔''

''میں نے بار بار آپ کو منع کیا۔ آپ نے اس وقت کیوں نہیں سنا؟'' پترکار نے بہت توبہ تلا کی۔ ''اب آپ کی بات ہمیشہ ضرور مانے گا۔ دیدی ہمارا بی بی کو مت بولنا۔''

اس وقت وہ شگوفہ نائٹ کلب میں بالکل پرستان میں پہنچے ہوئے تھے لہٰذا میری نظریں بچا کر ایک دور کی میز پر جا بیٹھے۔

''میری جان شب بخیر'' کے بعد خانم جمیلہ بیلی ڈانسر تشریف لائیں۔

> میرا خیال ہے مشرقی وسطیٰ کی یہ بیلی ڈانسر حُمقاء کو فوراً تاڑ لیتے ہیں۔ ناچ کے بعد اسٹیج سے اتر کر مٹکتی مٹکتی وہ سیدھی پترکار کی میز کی سمت گئی اور جا کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔'' (۵)

ایک موقع پر ان بزرگوار نے ایک ایسی برمحل بات کہی جس سے ان کی معقولیت ثابت ہوتی ہے:

> ''روضۂ حافظ میں سرو شمشاد کے کُنج۔ میوزیم چاءخانہ۔ پہلی بار پترکار نے ایک معقول بات کہی بولے۔ ''یہاں چاءخانہ کی بجائے مے خانہ ہونا چاہیے تھا۔'' پترکار پڑھے لکھے انسان تھے۔ ویدانت سے بھی علاقہ رکھتے تھے۔ خدا تعالےٰ کے اصلی سادہ دل بندے۔'' (۶)

روضۂ حافظ کے علاوہ مصنفہ نے شیخ سعدی کے مقبرے، پرس پولس کے سرخ کھنڈر، تختِ جمشید، نقشِ رستم، پہاڑ کے اندر تراشے ہوئے مقابر، کیتھڈرل چرچ، کوئے حکیم نظامی اور زندہ رود کی بھی ایک جھلک دیکھی اور دکھائی ہے۔ مصنفہ کی اس سفر میں اپنے ہم پیشہ صحافیوں اور مختلف ایرانیوں سے علیک سلیک رہتی ہے۔ آخر میں ایک مختصر ملاقات 'ایران میں اجنبی' (ن م راشد) سے بھی ہوتی ہے۔

''کوہِ دماوند'' کے دوسرے حصے کا قصہ یہ ہے کہ قرۃ العین ایک دوست کی معرفت ایران کی آخری ملکہ، شاہ بانو کی سوانح عمری تحریر کرنے کی غرض سے شاہی مہمان کی حیثیت سے ایران جاتی ہیں۔ جانے سے قبل وہ اپنے دوست پر واضح کر دیتی ہیں کہ ''روز اک تازہ قصیدہ، نئی تشبیہ کے ساتھ'' ان سے ممکن نہیں ہوگا۔ وہ سوانح عمری میں

''ہیومن اینگل'' کی پیش کش کو ملحوظ رکھیں گی۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ زیر بحث تصنیف ملکہ کی سوانح عمری نہیں، مصنفہ کے ایران میں گزارے گئے ان ایام کی رپورتاژ ہے جب وہ ملکہ کی مصاحب بنی ہوئی تھیں اور نجی و سرکاری مصروفیات میں شریک رہتی تھیں۔ یوں ملکہ اور مصنفہ کے جذبِ باہم سے یہ تحریر منصۂ شہود پر آئی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے ایران کی ایک عام لڑکی کی ملکہ بننے کی کہانی افسانوی رنگ میں پیش کی ہے اور اسے ''سنڈریلا سٹوری'' قرار دیا ہے۔ اس کہانی میں 'خاکۂ انسانی' اور 'افسانۂ ہستی'' کے دل پذیر عناصر شامل ہیں۔ قرۃ العین کے مشاہدے کے مطابق ملکہ ایک شائستہ، باوقار، رحم دل، سرگرم اور فعال خاتون تھیں۔ مصنفہ نے اس ضمن میں اپنے مشاہدات نقل کیے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''گاؤں کی عورتیں دوڑتی ہوئی آئیں۔ شاہ بانو کو گھیر لیا اور اپنے اپنے دکھ درد سنانے لگیں۔ ایک افسر ایک ٹوکری لئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گاؤں والوں کی درخواستیں اور خطوط جو انہوں نے شاہ بانو کے نام لکھے ہیں وہ اس ٹوکری میں ڈالتا جا رہا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ آشوبِ چشم میں مبتلا ہے۔ اسے بذریعہ طیارہ اسی وقت برائے علاج مشہد روانہ کیا جاتا ہے۔

اچانک ایک خفقانی عورت مجمع سے نکلی اور چیختی چلاتی فرح پہلو کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ یہ عورت دیوانی ہوگئی ہے اس کے شوہر نے اس پر بے انتہا مظالم کیے ہیں۔'' کسی نے مجھ سے کہا۔

وہ اسی طرح چیختی ہوئی شاہ بانو کا تعاقب کرتی رہی۔ پاگلوں کو بادشاہوں کا خوف نہیں ہوتا۔ اسے بھی برائے علاج مشہد روانہ کیا گیا۔'' (۷)

مصنفہ نے عہدِ شاہی کی عیاشی، خوش حالی اور فارغ البالی کی مرقع کشی کرتے ہوئے حقیقی رنگوں کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے 'جمالِ پادشاہی' کی متعدد رنگین تصاویر کھینچی ہیں۔ دراصل انہیں ہر طرف 'جمال' ہی دکھایا گیا تھا۔ ایک آدھ مقام پر انہوں نے از خود 'جمہوری تماشا' دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مصنفہ کو آئینہ ایام میں ملکہ کے ساتھ ساتھ کسی نیلم پری کی ادائیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

حواشی:

(۱) ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، داستان تاریخ رپورتاژ نگاری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۸۷

(۲) قرۃ العین حیدر، کوہِ دماوند، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص ۴۵

(۳) ایضاً، ص ۴۵، ۴۷

(۴) راحیلہ یوسف، قرۃ العین حیدر کے سفرناموں میں اسلوب اور تنقید کا تنوع، عامر

سہیل، ڈاکٹر، شوکت نعیم قادری (مرتبین) قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء، ص ۵۷۸

(۵) قرۃ العین حیدر، کوہِ دماوند، ص ۵۷

(۶) ایضاً، ص ۵۹

(۷) ایضاً، ص ۸۰

مآخذ:

۱۔ راحیلہ یوسف، قرۃ العین حیدر کے سفرناموں میں اسلوب اور تنقید کا تنوع، عامر سہیل، ڈاکٹر، شوکت نعیم قادری (مرتبین) قرۃ العین حیدر خصوصی مطالعہ، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۵ء۔

۲۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر، داستان تاریخ رپورتاژ نگاری، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۳۔ قرۃ العین حیدر، کوہِ دماوند، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۰ء۔

☆☆☆☆☆